R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

جلد ۲۷، شمارہ ۶ | ایڈیٹر آل احمد سرور | ۸ فروری ۱۹۶۸ء

اداریہ

علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم اور اردو

پہلی اور دوسری فروری کو بنارس میں ہندی کے علاقوں کے وائس چانسلروں کی کانفرنس ہوئی جس میں اترپردیش کی یونی ورسٹیوں کے علاوہ بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ اور مرکزی وزارت تعلیم کے نمائندے شامل تھے۔ اس کانفرنس نے یہ طے کیا کہ پانچ سے دس سال کے اندر علاقائی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کی تمام منزلوں تک ذریعہ تعلیم بنایا جائے اور انجینئرنگ، میڈیسن، قانون اور زراعت میں بھی پہلی ڈگری کے لیے ہندی ۱۹۷۳ تک استعمال کی جائے۔ اس کانفرنس نے تعلیمی کمیشن کی سفارشات کو مجموعی طور پر سراہا اور اس پر زور دیا کہ علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے، تعلیم کے معیار کو اور بہتر بنایا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے پروگرام کی سفارش کی جس کے ذریعے اساتذہ کی تربیت، معیاری ادب کی تیاری، حوالے کی کتابوں کی تیاری اور ایسے ہی اہم کام ضرورت کے مطابق ہو سکیں۔

اس وقت صورت یہ ہے کہ علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دینے کے اصول سے بہت کم لوگوں کو اختلاف ہے۔ اول تو ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے کو خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے اور مناسب تیاری اور معیار کی نگرانی کے بعد تبدیلی کرنی چاہیے، خواہ مخواہ سیاسی فائدے حاصل کرنے کے لیے جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ دوسرے اس کے معنی ہرگز یہ نہ ہونے چاہئیں کہ یونی ورسٹی کی منزل پر انگریزی کی تعلیم کا ایک اچھا معیار نہ ہو۔ اگر ان دونوں باتوں کی طرف سے اطمینان ہو جائے یعنی اول تو تبدیلی مناسب تیاری کے بعد اور تیاری کے لیے نہ خواہ مخواہ دیر لگائی جائے نہ بلا وجہ جلدی کی جائے اور دوسرے ایک عالمی زبان یعنی انگریزی کو ترک کرنے کے بجائے اس میں بھی اچھی خاصی صلاحیت پر اصرار کیا جائے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ لوگ جو نیک نیتی سے اس تبدیلی میں بہت سے خطرے دیکھتے ہیں اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اپنی رائے میں تبدیلی کرلیں گے۔ اس وقت دو حقائق ایسے ہیں جنھیں ہم کسی حال میں فراموش نہیں کر سکتے۔ اول تو ستر میں سے چھتیس یونی ورسٹیوں میں علاقائی زبانیں ذریعہ تعلیم ہیں اور پہلی ڈگری کے لیے علاقائی زبانوں کو ذریعہ بنانے کا کام بڑی حد تک عمل میں آگیا ہے۔ دوسرے مجموعی طور پر انگریزی کا معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ عام طور پر یونی ورسٹیوں کے گریجویٹ انگریزی میں لٹریچر سے اس طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے جس طرح اٹھانا چاہیے۔ اس لیے محض معیاروں کا نام لے کر یا ملک کی یک جہتی کی دہائی دے کر، انگریزی کے ذریعے موجودہ حالات کو چلانا کسی طرح ملک کی خدمت نہ ہوگی بلکہ ایک طرف مناسب تیاری کے بعد علاقائی زبانوں میں اچھی، معنی خیز اور ذہن کو بیدار کرنے والی تعلیم دینا اور ساتھ ہی ساتھ یونی ورسٹیوں کے طلبہ کے لیے انگریزی کے ایک اچھے معیار پر اصرار کرنا ہر طرح موزوں اور مناسب ہوگا۔ پھر طلبہ اور اساتذہ میں جو خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تدریس اس زبان میں ہوتی ہے جو طلبہ اور اساتذہ میں پورا ذہنی اشتراک نہیں ہونے دیتی، استاد طالب علم کی تمام تر توجہ حاصل نہیں کر سکتا اور طالب علم معلومات حاصل کرتا ہے مگر یہ معلومات اس کے لیے کوئی کیفیت نہیں رکھتیں، اس لیے طلبہ کی فکر کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ان کی تدریس کا کام علاقائی زبانوں میں ہو۔

اس سلسلے میں اردو میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کا تجربہ عثمانیہ یونی ورسٹی کے ذریعے سے کامیابی سے ہو چکا ہے۔ آج بھی ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم اردو کے ذریعے سے دی جا رہی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، عثمانیہ یونی ورسٹی اور جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے ارباب حل و عقد کو جلد سے جلد اس سلسلے میں مناسب اقدامات کرنے چاہئیں۔ تعلیمی کمیشن نے اردو کے لیے دو ایسے اعلیٰ تعلیم کے مراکز کی سفارش کی ہے جو اساتذہ کی تربیت اور کتابوں کی تیاری کا کام کریں اور یہ بھی کہا ہے کہ ایک مرکز شمالی ہند میں اور ایک جنوبی ہند میں ہونا چاہیے۔ مرکزی وزیر تعلیم نے کچھ عرصہ ہوا اعلان کیا تھا کہ ہر زبان میں کتابیں تیار کرنے اور اساتذہ کی

تربیت کے کام کے لیے ایک کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اگر یہ صحیح ہے تو اب اردو کے لیے دو مرکز قائم کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ علمی اصطلاحات کا مسئلہ، کتابوں کی تیاری، پھر ان کتابوں کی طباعت، اساتذہ کی تیاری، یہ کام خاص محنت اور وقت چاہتے ہیں۔ اس لیے مرکزی وزارت کو چاہیے کہ وہ اردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے لیے جلد سے جلد علی گڑھ یا کسی اور موزوں جگہ ایک مرکز شمال میں اور دوسرا مرکز حیدرآباد میں قائم کرنے کی تجویز پر غور کرے۔ ریاستی حکومتیں اپنی اپنی ریاستی زبان کے لیے خود مناسب تیاری کریں گی مگر اردو کے لیے اقدامات مرکزی حکومت کو کرنے ہوں گے۔ اس لئے اب اس کام میں ہرگز دیر نہیں کرنی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جموں و کشمیر یونی ورسٹی اور عثمانیہ یونی ورسٹی کو بھی سوچنا چاہیے کہ وہ اردو میں اپنی پہلی ڈگری دینے کے لیے کب سے قدم اٹھا سکتی ہیں اور اس کے لیے انھیں کتنی تیاری اور کتنے وسائل کی ضرورت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ادارے اگر پہل کریں تو مرکزی حکومت بھی جلد قدم اٹھا سکے گی اس وقت ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں اپنی منزل متعین کر لینی چاہیے اور اس کے بعد اس منزل تک پہنچنے کے لیے مناسب انتظامات شروع کر دینے چاہئیں۔

گورکھپور یونی ورسٹی میں جشن غالب کی تقریبات کے لیے کمیٹی کا قیام

گورکھپور۔ گورکھپور یونیورسٹی کے تمام شعبوں کے سربراہوں کا ایک جلسہ حال ہی میں وائس چانسلر جناب مدن موہن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں جشن غالب منانے کے لیے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر آر۔ پی۔ بہادر ڈین فیکلٹی آف اگریکلچر ہوں گے کمیٹی کے دیگر ممبران کے نام یہ ہیں:

۱۔ پروفیسر ایس۔ پی۔ مسرا ڈین فیکلٹی آف آرٹس

۲۔ ڈاکٹر ہری شنکر سریواستوا، صدر شعبۂ تاریخ۔

۳۔ جناب جتیندر کمار، صدر شعبۂ فائن آرٹس۔

۴۔ ڈاکٹر محمود الٰہی، صدر شعبۂ اردو۔

کمیٹی میں یہ طے کیا گیا ہے کہ غالب کی صد سالہ تقریبات شایان شان طور پر منائی جائیں گی۔

اختر نظمی

موج

ایک آنچل ہوا میں لہرا کر
آرزوؤں کے پھول بکھرا کر
دل کو چھوتا ہوا گزر بھی گیا
نکہتیں جاگ اٹھیں جدھر بھی گیا
جھوم کر اک ادا سے لہرا کر
جاتے جاتے مرے قریب آ کر
رک گئی ایک موج خوشبو کی
اتنی سرکش کہ راہ روک ہی لی
شوخ ایسی کہ ساتھ ساتھ اپنے
لے گئی دور تک اڑا کے مجھے
کیف زا وادیوں میں چھوڑ آئی
میں انھیں وادیوں میں گم ہو آئی!

"مخدوم ایک مطالعہ" کی اشاعت

اردو کے ممتاز شاعر مخدوم محی الدین کی حیات، شخصیت اور شاعری پر جناب داؤد اشرف ایم۔ اے (اردو) جامعہ عثمانیہ کی کتاب "مخدوم ایک مطالعہ" شائع ہو چکی ہے جناب داؤد اشرف نے ایم۔ اے (اردو) کے امتحان کے لیے مخدوم صاحب کی شخصیت، سیرت اور فکر و فن پر جو مقالہ تیار کیا تھا اسے نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے اس کتاب سے انجمن تحفظ اردو آندھرا پردیش کے اشاعتی پروگرام کا بھی آغاز ہو رہا ہے۔

مغربی بنگال میں جشن غالب کی تیاری

کل اورینٹل چیمبر آف کامرس کے صدر جناب جی ایم طاہر کے ایما پر مرزا غالب کی صد سالہ برسی کی مغربی بنگال میں تیاریوں کے سلسلے میں غور کرنے کے لیے کلکتہ کے نمائندہ ادیبوں، شاعروں اور دیگر معتبر ہستیوں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں غالب کی صد سالہ برسی کے سلسلے میں ضروری امور کی انجام دہی کے لیے ایک ایڈہاک کمیٹی کی ضرورت پر غور کیا گیا جس میں غالب کی صد سالہ برسی کے جشن کی تیاریوں سے متعلق مرکزی کمیٹی کی جو ہدایات تھیں ان کے بعض گوشوں پر احتراضات کی وجہ سے فیصلہ کیا گیا کہ پہلے ان باتوں کی مرکز سے وضاحت طلب کی جائے۔ اس سلسلے میں تمام معاملات طے کرنے کی غرض سے پانچ افراد جی ایم طاہر، سالک لکھنوی، عبدالمجید یوسف فیروزی، اور میئر کلکتہ کارپوریشن جی۔ سی۔ ڈے صاحبان پر مشتمل ایک ایڈہاک کمیٹی بنا دی گئی۔

مشہور صحافی پریم چند ورما کی اپیل

مشہور صحافی جناب پریم چند ورما جو ہماچل پردیش سے پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں انھوں نے ایک خط کے ذریعہ بتایا ہے کہ وہ ملک بھر میں صحافت کے سلسلہ میں جو دشواریاں ہیں انھیں دور کرنے کی کوشش کریں گے چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل: قومی کے بارے میں ذہنوں کی تجاویز مانگی ہیں ...گورنمنٹ کی اشتہار دینے کی پالیسی کے بارے میں ...آل انڈیا ریڈیو کے مختلف شعبوں کی پالیسیوں پر تجاویز ...صحافت، صحافیوں اور نامہ نگاروں کے بارے میں تجاویز۔ تجویزیں اس پتہ پر بھیجی جائیں۔

جناب پریم چند ورما ایم۔ پی ۸/۱۸۸ اجمیری گیٹ دہلی ۶

ڈاکٹر سید سلیمان حسین

مثنوی اور اس کی تکنیک — ایک مختصر جائزہ

اصنافِ سخن میں مثنوی سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے[1] کیونکہ اس میں ہر قسم کے وسیع مضمون اور مربوط خیال نہایت خوبی سے ادا ہو سکتے ہیں۔

مثنوی عربی لفظ ہے جسے اس زبان میں مزدوج بھی کہتے ہیں اور خیال ہے کہ سب سے پہلی مثنوی عربی میں کہی گئی، مگر عربوں نے اس صنفِ سخن کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ عربی میں جو چند مثنویاں ملتی ہیں وہ کسی اعتبار سے بھی قابلِ ذکر نہیں۔ اس صنف کو معراجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا فارسی شعراء کے سر ہے انھوں نے مثنوی نگاری کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

محققین نے فارسی شاعری میں ابوشکور بلخی کو مثنوی کا موجد تسلیم کیا ہے اور اس کی مثنوی کو قدیم ترین مثنوی مانا ہے۔ رودکی کا نام اس کے بعد آتا ہے جو ابوشکور بلخی کے آخر عمر کا ہمعصر شاعر ہے۔

لفظ مثنوی منسوب ہے مثنیٰ کی طرف اور مثنیٰ میم مفتوح و سکون ثائے مثلثہ والف مقصورہ سے دو کے معنی میں ہے جب یائے نسبت اس کے آخر میں لگائی گئی تو الف مقصورہ واؤ سے بدل گیا اور اصطلاح میں ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں دو دو مصرع باہم مقفیٰ ہوں۔[2]

مثنوی کے لیے اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے بقول امداد امام اثر ممکن ہے کہ چار شعر کی مثنوی ہو یا چار لاکھ کی۔ فارسی میں بڑی بڑی اور ضخیم مثنویاں لکھی گئیں مثلاً فردوسی کا شاہنامہ جسے عجم قرآن العجم کہتے ہیں اور مثنوی مولانا روم جن میں اشعار کی تعداد تخمیناً ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ پہنچ گئی ہے مگر اردو میں غزل کی مقبولیت اور دیگر وجوہ کی بنا پر اتنی ضخیم مثنویاں نہیں لکھی گئیں۔

اشعار کی تعداد کے بجائے شعراء متقدمین نے مثنوی کے لیے چند بحریں اور اوزان مقرر کئے ہیں ان میں مثنوی لکھنا مستحسن خیال کیا جاتا ہے جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

(۱) بحر متقارب مثمن محذوف الآخر یا مقصور الآخر۔ یہ بحر رزمیہ کے لیے مخصوص ہے فارسی میں شاہنامہ، اردو میں مثنوی سحرالبیان، تاریخ بدیع (امیر اللہ تسلیم لکھنوی)، مثنوی لذتِ عشق (آغا حسن نظم لکھنوی) اسی بحر میں ہیں ؎

خفا زندگانی سے ہونے لگی بہانے سے جا جا کے سونے لگی

(۲) بحر ہزج مسدس محذوف الآخر یا مقصور الآخر۔ یہ بحر عشق و محبت کے خیالات نظم کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہے مثلاً جامی کی مثنوی یوسف زلیخا، اردو میں نسیم کی مثنوی گلزار نسیم اسی بحر میں ہیں۔ منیر شکوہ آبادی نے اپنی مشہور مذہبی مثنوی معراج المضامین بھی اسی بحر میں نظم کی ہے ؎

سنہری تھالیاں چمک سے روشن بجا سے دوب اگسی دھوپ چندن

(۳) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر یا مقصور الآخر۔ یہ بحر بھی عاشقانہ خیالات نظم کرنے کے لیے مناسب و زوں خیال کی جاتی ہے جیسے نواب مرزا شوق لکھنوی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں، امیر لکھنوی کی مثنوی ورقۃ التاج اور شوق لکھنوی کی مثنوی ترانۂ شوق اسی بحر میں ہے ؎

معدوم تھا وہ اس شعر سنا آنکھیں بھی نیچی نہیں، رنگ فق تھا

(۴) بحر خفیف مسدس مخبون محذوف الآخر یا مقصور الآخر

اس میں شعراء مواعظ اور حقائق و حکم نظم کرتے ہیں۔ حدیقہ حکیم سنائی مسلمت الاہب اہم اموری جاتی اور مثنوی حسب دلی (حالی) اسی بحر میں ہیں۔ بعض عشقیہ مضامین بھی اس بحر میں خوب نظم کئے گئے ہیں، جیسے میر نے دریائے عشق، نواز حسین تسلیم سہسوانی نے مثنوی سعدین، عطا لکھنوی نے مثنوی طلسم الفت اور شوق لکھنوی نے مثنوی زہرِ عشق اسی بحر میں نظم کی ہیں ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

(۵) بحر رمل مسدس محذوف الآخر یا مقصور الآخر۔ اس میں حقائق و معارف، پند و نصائح بیان کئے جاتے ہیں جیسے عطار نے منطق الطیر، مولانا روم نے مثنوی معنوی اسی بحر میں لکھی ہیں۔ سودا نے چند ہجویات اور میر نے بعض مثنویاں بھی اسی بحر میں نظم کی ہیں ؎

ساست عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

(۶) بحر رمل مسدس مخبون محذوف الآخر یا مقصور الآخر ؎

اب تو آنے میں تامل نہ کرو نہ کرو مجھ سے تغافل نہ کرو

(۷) بحر سریع مسدس مطوی مکشوف الآخر یا مقصور الآخر۔ سوائے عشقیہ مضمون کے سب کچھ اس بحر میں زیبا ہے۔ فارسی مثنویاں مخزن الاسرار (نظامی)، مثنوی تحفۃ الاحرار (مولانا جامی) اس بحر میں ہیں۔ سودا نے لاٹھی کی تعریف اور حکیم مومن کی ہجو اسی بحر میں لکھی ہے ؎

کشتنِ خلق اس کا غرض کام ہے مرگ و قضا سفت میں بدنام ہے

ان سات بحروں کے علاوہ دوسری بحروں میں مثنوی لکھنا مستحسن خیال نہیں کیا جاتا لیکن شعراء نے کبھی اس کی پابندی نہیں کی۔ میر تقی میر نے اپنی مثنوی جوشِ عشق بحر مستزاد کے مجنون ساکن میں لکھی جو غزل کے لیے شگفتہ خیال کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بحر مضارع مثمن مکفوف مقصور یا محذوف اور بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور (نغمۂ جاوید، اثر لکھنوی) نیز دیگر بحور میں مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

مثنوی کا ڈھانچہ حمد، نعت، منقبت، بادشاہ یا ممدوح کی تعریف، تعریفِ سخن، تعریفِ عشق، وجہ تالیف اور داستان سے مرکب کیا جاتا ہے مگر مثنویات کے جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ یہ ساری چیزیں مثنوی کے لیے ضروری نہیں ہیں۔ ان سے علیحدہ بھی طریقۂ کار عمل میں لایا جا سکتا ہے جیسے میر نے کیا ہے۔

ارکان و اجزاء کی بحث کے بعد مثنوی کے موضوعات کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کے لیے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں ہے اس میں انسانی فکر و تخیل کا ہر موضوع بحسن و خوبی نظم ہو سکتا ہے۔ مضامین کے اعتبار سے اگر ان کی تقسیم کی جائے تو یہ ان عنوانوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ رزمیہ، بزمیہ، عشقیہ، متصوفانہ، عارفانہ، اور فلسفیانہ۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مرتبہ وحید قریشی صفحہ ۲۰۵

[2] لغات کشوری صفحہ ۵۰۴

[3] بحر الفصاحت از مولوی نجم الغنی صفحہ ۸۰

[4] کاشف الحقائق حصہ دوم صفحہ ۲۰۰

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہونے کے ساتھ ساتھ نظم کی سب سے جامع قسم بھی ہے۔ اس میں شاعری کے تمام اصناف اپنی پوری خوبیوں اور محاسن کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بقول جلال الدین جعفری "اس میں غزل کا سوز و گداز، معاملہ بندی، لگاوٹ اور گھلاوٹ، قصیدہ کی تشبیب کی رنگینی، شان و شوکت اور دھوم دھام، نظم کا تسلسل بیان، مرثیے کا غم و الم، رزم کی جنگ، سراپا اور ساقی نامہ کا جوش بھی اور سب کے اوصاف کا اجتماع پایا جاتا ہے"۔ نظم کی ان خصوصیات کے علاوہ نثر کی محبوب طرز داستان گوئی کا انداز بھی ملتا ہے یعنی مثنوی میں نظم کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک کہانی کا پورا پلاٹ اپنے جملہ خصائص کے لحاظ سے ہونا ضروری ہے۔

اردو میں پہلی بار مولانا الطاف حسین حالی مرحوم نے مثنوی کی تنقید اور اسے جانچنے اور پرکھنے کے لیے کچھ اصول مرتب کئے۔ اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی نے مثنویوں کا جائزہ لینے کے لیے ان خصوصیات کو پیش نظر رکھا جو شاہنامہ فردوسی میں پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں مثنوی کے لیے ضروری خصائص انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کئے جا رہے ہیں۔

زبان

مثنوی کے لیے زبان میں سادگی، شستگی اور روانی ہونا اشد ضروری ہے پھر زبان میں جس قدر فصاحت، بلاغت، شیرینی، اور چستی ہوگی اسی قدر مثنوی پاکیزہ اور معروف ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کو روزمرہ اور محاوروں سے بھی مزین ہونا لازمی ہے۔

تسلسل اور انداز بیان

مثنوی چونکہ ایک مسلسل اور توضیحی صنف سخن ہے اس لیے بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہونا چاہئے کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چپاں ہوتی چلی جائے، نہ تو بیان میں جھول پیدا ہو اور نہ کلام بے ربط ہونے پائے۔ اگر کسی مثنوی میں تسلسل کا خیال نہیں رکھا گیا تو اس کا دبدبہ گر جائے گا۔ انداز بیان میں گھلاوٹ اور نرمی، رسیلا پن، آمد اور سوز و گداز کا ہونا لازمی ہے۔ جہاں موقع محل ہو وہاں طنز و مزاح، شوخی و شرارت، متانت اور سنجیدگی بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔

موضوع اور پلاٹ

شاعر کے ذہن میں موضوع واضح ہونا چاہئے تاکہ اس کی مدد سے جو پلاٹ تیار کیا جائے وہ شاندار اور ہر طرح سے مکمل ہو۔ بنیادی خیال میں پیچیدگی اور ابہام نہ پیدا ہو اگر یہ خامی پیدا ہو گئی تو مثنوی کبھی اپنی بلندیوں کو نہیں پہنچ سکتی۔

مشاہدہ

پلاٹ کی تیاری کے لیے شاعر کا مشاہدہ وسیع ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ جزئیات پر آسانی سے نظر کر سکے۔

واقعہ نگاری

مثنوی میں واقعہ نگاری سے یہ مراد ہے کہ جس واقعہ کا بیان ہو اس کی اصلی اور صحیح تصویر ذہن میں ابھر آئے۔ واقعہ نگاری میں جذبات پر بھی توجہ ہونا ضروری ہے کیونکہ بعض اوقات معمولی اور جزوی بات سے بھی واقعہ کی تصویر اس طرح کھنچ جاتی ہے کہ بڑے سے بڑے واقعات کے ادا کرنے سے بھی نہیں کھنچ سکتی۔ پھر یہ بھی لازمی ہے کہ مثنوی میں جو واقعہ بیان کیا جائے وہ دوسرے واقعہ کی تکذیب نہ کرے اور ایک بیان دوسرے بیان کے منافی نہ ہو۔

جس طرح یہ ضروری ہے کہ جن باتوں کو بنیاد بنا کر قصہ ترتیب دیا گیا ہے وہ صاف اور صراحت کے ساتھ بیان کر دی جائیں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ باتیں جو کھل کر نہیں کہی جا سکتیں وہ رمز و کنایہ میں بیان کی جائیں مثلاً شرم و حجاب اور اختلاط وغیرہ کے ذکر میں یہ احتیاط لازم ہے۔

منظر نگاری

مثنوی میں مختلف قسم کے واقعات کی وجہ سے متعدد قسم کے مناظر، رسوم اور تقریبات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی منظر کشی کی جائے وہ سچی اور فطری ہو۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یعنی مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ صحیح اور نیچر اور عادت کے موافق ہو۔

کردار نگاری

مثنوی میں متعدد قسم کے کردار آتے ہیں اور بہت سے طبقوں کے لوگوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، عالم و جاہل، عابد اور پارسا وغیرہم۔ چنانچہ شاعر کا ایک اہم اور بنیادی فرض ہے کہ وہ ان سب کے اخلاق و عادات، حرکات و سکنات کو اس کی امتیازی شان اور خصوصیات کے ساتھ بیان کرے۔ اگر ایک کردار شاہانہ دکھایا گیا ہے تو اس کی گفتگو کبھی ایسی نہ ہو جو بادشاہوں کے رتبہ اور مرتبہ سے گری ہوئی ہو۔ اس کے اطوار سے ہمیشہ یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شریف، عادل، منتظم، مردم شناس اور علم دوست ہے۔ شجاع اور بات کا دھنی ہے۔ اگر ملازم کا کردار ہو تو اسے آداب ملازمت سے آگاہ ہونا چاہئے۔ حفظ مراتب کا لحاظ ضروری ہے۔ غرض کہ کرداروں کی سیرت کی تہوں کو کرید کرید کر کام کی چیز باہر لے آنا، کرداروں کے مدارج کا خیال رکھنا اور ان کو سلیقے کے ساتھ برتنا اور آخر تک نبھانا شاعر کا کمال ہے۔

جناب عبد القادر صاحب سروری نے اپنی کتاب "اردو مثنوی کا ارتقا" میں مثنوی کی بڑی جامع اور مکمل تعریف کی ہے۔ اس مضمون کو موصوف ہی کے بیان پر تمام کیا جاتا ہے۔

"مثنوی آرٹ کے نقطہ نظر سے دیکھی جائے تو ایک نہایت بسیط مرکب اور کسی قدر پیچیدہ صنف ہے جس کے تمام فنی زاویوں پر روشنی ڈالنے کے باوجود لطف و خوبی کا ایک بڑا حصہ تجزیہ اور تشریح سے بلند نظر آتا ہے۔ یہ صناع کا ذاتی جز و ہوتا ہے اور یہی آرٹ ہے اس لیے ایک ترقی یافتہ تمدن اور معاشرہ کے لازمی اجزاء کے طور پر مربوط خیالی واقعات کے ارتقاء اور ایک حسین مقصد پر ان کے اختتام کی جب تک قدر و منزلت رہے گی مثنوی کے طرز کی شاعری کی اہمیت گھٹ نہیں سکتی۔"

سید محمد علی کاظمی

قاضی عبدالغفار عمر اور سنِ پیدائش

قاضی صاحب کی پیدائش کے ماہ و سال کا صحیح صحیح تعیین نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں کافی چھان بین کی گئی، لیکن حرفِ آخر کی صورت میں کسی نتیجے پر نہیں پہونچا جا سکا۔

قاضی صاحب کی بیگم اور ان کی حقیقی بہن کے بیان کے مطابق قاضی صاحب کی عمر انتقال کے وقت چھیاسٹھ سال تھی۔ قاضی صاحب کا انتقال ۱۷ر جنوری ۱۹۵۶ء کو ہوا۔ اس حساب سے ان کا زمانہ پیدائش ۱۸۹۰ء کے ابتدائی ایام یا پھر ۱۸۸۹ء کا آخری زمانہ سمجھا جا سکتا ہے۔

اپنے سفرنامے "نقشِ فرنگ" کے مقدمے میں قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

"........ عمر کے تقریباً ۴۲ سال اسی بدنصیب ملک میں گزارے ......"

نقشِ فرنگ کا یہ مقدمہ اپریل ۱۹۲۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قاضی صاحب کا سالِ پیدائش ۱۸۸۵ء ہو سکتا ہے۔ اپنی ایک دوسری تصنیف "عجیب" کے ایک مضمون میں قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں میری عمر ۲۳ سال تھی۔ اس حساب سے بھی سالِ پیدائش ۱۸۸۵ء نکلتا ہے۔

مولانا محمد علی پر قاضی عبدالغفار کا ایک مضمون دسمبر ۱۹۳۲ء کے اخبار "حریت" دہلی میں شائع ہوا تھا اس میں قاضی صاحب نے لکھا ہے۔

"........ اب دسمبر ۱۹۱۲ء کی اس صبح کو .... یہ وہ زمانہ تھا کہ میری عمر ۲۱ سال سے زیادہ نہ تھی۔"

اس عبارت پر بھروسہ کیا جائے تو قاضی صاحب کا سنِ پیدائش ۱۸۹۰ء کا بالکل آخری یا پھر ۱۸۹۱ء کا بالکل ابتدائی زمانہ ہو سکتا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پندرہ روزہ ترجمان "ہماری زبان" مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۶ء کے مطابق "قاضی صاحب کی عمر انتقال کے وقت اڑسٹھ سال تھی۔ مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ مورخہ ۸ر فروری ۱۹۵۶ء میں "قاضی صاحب کی وفات کی جو خبر شائع ہوئی اس میں بھی ان کی عمر وہی اڑسٹھ سال بتائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے قاضی صاحب کا سالِ پیدائش ۱۸۸۷ء کا آخر یا ۱۸۸۸ء کا ابتدائی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

عمر کے سلسلے میں کیونکہ خود قاضی صاحب کے اپنے بیانات میں کافی اختلاف اور تضاد موجود ہے اس وجہ سے ان بیانات میں سے کسی بیان کو بھی حرفِ آخر کے طور پر نہیں مانا جا سکتا۔ ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب کا "نقشِ فرنگ" کا بیان زیادہ صحیح ہونے کا امکان ہے۔ کیونکہ وہ بیان خود ان کی نوعمری کے زمانے سے زیادہ قریب ہے۔ اور پھر اس بیان کی تائید خود قاضی صاحب ہی کے ایک مضمون مشمولہ "عجیب" سے بھی ہوتی ہے جس کی بنا پر ان کا سنِ پیدائش ۱۸۸۵ء ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ نتیجہ نکالنے کے ساتھ ہی ساتھ خود ان کے اپنے مختلف اور متضاد بیانات ہونے کی وجہ سے اس بات کو بھی نظر میں رکھنا ہے کہ قاضی صاحب اپنی نوعمری کے زمانے میں ہی سیاسی دنیا میں داخل ہو گئے تھے۔ لیڈری کا ذوق و شوق نیا نیا تھا۔ لیکن اپنے گرد وہ اپنے سے بہت زیادہ عمر اور تجربہ کار لوگوں کو دیکھتے تھے۔ اور اپنی نوعمری کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ میدانِ سیاست میں انھیں اپنی نوعمری کا احساس ستاتا رہا ہو۔ کیونکہ عام طور سے ہندوستانی سماج میں زندگی کے کسی بھی شعبے میں نوعمر ذہین اور نوجوان طبقے کو اکثر اہلیت ہونے کے باوجود وہ درجہ اور مقام نہیں دیا جاتا جو اس کے مقابلے میں قابلیت یا اہلیت میں کمتر لیکن معمر اور تجربہ کار حضرات کو دیا جاتا رہا ہے۔

اس روشنی میں یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ قاضی صاحب نے اس وقت سمجھ جانے کی حد تک اپنی عمر کچھ بڑھا کر بتائی ہو۔

لیکن اس چیز سے قطع نظر اگر ہم "نقشِ فرنگ" اور "عجیب" کے بیان کو صحیح ان بھی لیں تو پھر بعد والے بیانات سے پیدا ہونے والے تضاد کی وجہ معلوم کرنا ہوگی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کے بعد والے بیانات سے ان کی عمر میں تقریباً پانچ سال کا فرق کم ہو جاتا ہے۔ یہاں نفسیات کے اس پہلو کو نظر میں رکھنا ہوگا کہ انسان جیسے جیسے اپنی عمر کی آخری منازل طے کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اسے اپنی بڑھتی یا گھٹتی ہوئی عمر کا احساس ستانے لگتا ہے۔ اس احساس کے ردِ عمل کے طور پر وہ خود اپنی ذہنی و قلبی تسکین کی خاطر اپنے دوست احباب میں اپنی عمر کم سے کم کرکے بتانے کی کوشش کرتا ہے اس طرح وقتی طور پر وہ حقیقت سے فرار و گریز اختیار کرکے اپنے لیے کچھ سکونِ قلب کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قاضی صاحب کے یہاں بھی بعد والے بیانات میں یہی نفسیاتی جذبہ کارفرما رہا ہو۔ اس لیے ان میں سے کسی بھی بیان کو بنیاد مان کر قاضی صاحب کے سنِ پیدائش کے تعین کے سلسلے میں حقیقتِ حال کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔

اس صورت کے پیشِ نظر اب لے دے کے صرف ایک ذریعہ اور باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ ہے قاضی صاحب کا مڈل اسکول کا سارٹیفکٹ۔ یہ سارٹیفکٹ مذکورہ بالا بیانات میں سے کسی کی بھی تائید نہیں کرتا۔ اس سارٹیفکٹ کے مطابق جنوری ۱۹۰۲ء میں یعنی مڈل کا امتحان دینے کے وقت قاضی عبدالغفار کی عمر بارہ سال گیارہ ماہ تھی۔ تاریخِ پیدائش اس میں بھی درج نہیں ہے

(باقی صفحہ ۱۰ پر)

رضی الدین احمد آبادی

غزل

مزاجِ زندگی بدل، مزاجِ شاعری بدل
جنوں کا ہاتھ تھام کر خرد کے ساتھ ساتھ چل
نہ ذکرِ ساز و نغمہ کر، نہ شغلِ دورِ جام کر
فقط یہ سوچ کیوں ہے رقصِ قتلِ عام آج کل
صنم کدوں کو بھول جا حرم کا نام بھی بدل
نئی فضا تلاش کر، نئی ہواؤں میں مچل
جدید حسنِ آگہی، جدید طرزِ زندگی
یہی ہے یادِ ارتقا، اسی ادا کے ساتھ چل

مراسلات

سیماب۔ اور داغؔ کی شاگردی

ہماری زبان مورخہ ۸ر جنوری ۹۸ء میں جناب حافظ عاشق صاحب نے جناب ویریندر پرشاد سکسینہ کے اس شک کو رفع کیا ہے کہ علامہ سیمابؔ داغؔ کے شاگرد نہیں تھے۔

اس سلسلے میں حضرت سیماب کی لکھی ہوئی کتابوں اور تذکروں کے حوالے دیتے ہوئے بتایا ہے کہ علامہ مرحوم نے متعدد جگہ خود تحریر فرمایا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ داغؔ کے شاگرد تھے۔

میں حافظ عاشق صاحب کی تمام تصدیقوں کی تائید کرتے ہوئے یہ اضافہ کرتا ہوں کہ علاوہ علامہ سیماب کے دوسرے ممتاز تلامذۂ داغ نے بھی متعدد مقامات پر اس کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ داغؔ کا ممتاز اور نمایاں شاگرد تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے میں صرف دو بزرگوں کے مضامین کے اقتباسات حوالوں کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

مولانا حضرت احسن مارہروی مرحوم نے کاروان ۱۹۳۰ء میں "جو شاعر" آگرہ کا خاص نمبر ہے ایک مضمون لکھا ہے بعنوان "داغؔ کے نورتن" اس میں سیماب صاحب کو داغؔ کے نورتنوں میں شمار کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے ؎

"۱۸۹۸ء میں آپ کو جہاں استاد سے بذریعہ خط و کتابت شرف تلمذ حاصل ہوا آپ تمام تلامذۂ فصیح الملک میں ایسے فرد وحید ہیں کہ مدت مدید سے شعر و سخن میں اپنا پورا وقت صرف کرتے ہیں۔"

اسی کاروان میں مذکور ابوالمعظم نواب حضرت سائل دہلوی مرحوم (داماد حضرت داغؔ) اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں ؎

"مسند نشین شعرالادب دارالاشاعت اکبرآباد عاشق حسین سیماب تخلص بہترین تلامذہ یادگار جہاں استاد نواب فصیح الملک داغؔ دہلوی ہے۔"

بہت سی تعریفوں کے بعد خاتمے پر فرماتے ہیں ؎

"اس کی ذات سے مجھے دستوار علاقہ ہے وہ میرا قوت بازو ہے ہنرمند ہے محاسن ادب میں بے مثل ہے جدت پسند طبیعت فطرت سے لے کر پیدا ہوا ہے اپنے استاد بھائیوں کے لیے مایۂ نازش و افتخار ہے ہم سب کا اعتبار دو چند اور بڑھنے کے لیے ہمارا ہم سلک قدرت نے اسے کر دیا ہے۔ میں سیماب بھائی کو معزز خطاب جانشین داغ دیتا ہوں جس کا حق مجھے حاصل ہے کہ میں جہاں استاد فصیح الملک کے سلسلۂ تلامذہ میں وہ منصب رکھتا ہوں جو ان کے کسی شاگرد کو میسر نہیں (یعنی وہ داماد بھی تھے)۔"

یہ دونوں ہستیاں کس پایہ کی تھیں اور ان کی تحقیق و اسناد کیا مرتبہ رکھتی ہیں اس پر میں کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ البتہ مزید اطمینان یا ضیافت طبع کی خاطر ایک اصلاحی غزل کے دو اشعار پیش کرتا ہوں۔

شعر سیماب ؎

قیامت خیز نالوں میں شب ماتم نکلتا ہے کہ وہ بے تاب ہو جاتا ہے جب پر دم نکلتا ہے

اصلاح داغؔ ؎

قیامت خیز نالوں میں مرا عالم نکلتا ہے الٰہی اس کے دم کی خیر جب پر دم نکلتا ہے

شعر سیماب ؎

گرجتا ہے نہیں ابر بہاری موسم گل میں شہیدوں کا تب کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

اصلاح داغؔ

گرجتا ہے نہیں ابر بہاری موسم گل میں شہید ناز کا کرتا ہوا ماتم نکلتا ہے

(شفا گوالیاری)

یک نگاہے

ہماری زبان مورخہ یکم جنوری ۹۸ء کے دوسرے صفحہ پر بشیر انور کی نظم نیا سال شایع ہوئی ہے۔ یہ نظم ہیئتی اعتبار سے آزاد ہے۔ اس میں کسی بحر کی پابندی تو نہیں کی گئی ہے تاہم وزن کی پابندی پورے طور سے نمایاں ہے۔ اس کے مصرعے بحر متقارب کے رکن "فعولن" کے رشتہ میں پروئے گئے ہیں۔

زیر نظر نظم کا یہ مصرع۔ قحط، بھوک، بیماری، جنگ، جاحیت، غلامی زدہ، اور افلاس کے۔ وزن کی پابندی نہ کر سکا۔ اگر لفظ "قحط" کو بہ حرکت "ح" پڑھا جائے تو موزوں ہو جائے گا لیکن قحط (بحرکت حائے حطی) صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قحط میں "ح" ساکن ہے متحرک نہیں۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ اسے بشیر انور نے غلط کیوں نظم کیا جب کہ عام طور پر ہر پڑھا لکھا انسان اپنی بول چال میں قحط کو "ح" کے سکون کے ساتھ استعمال کرتا ہے علاوہ اس کے کوئی دوسری بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بشیر انور صاحب اس نقطہ کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی نظم کو ہماری زبان کے ایڈیٹر صاحب نے اپنے موقر اخبار میں جگہ کیوں دی؟

اس قسم کی لغزشیں شعرائے ماسلف کے یہاں پائی جاتی ہیں لیکن شاذ و نادر مگر موجودہ عہد کا ادب اس کا بری طرح شکار ہو گیا ہے اس کی بہتات کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ہمارے صاحب فن شعرا کی بے توجہی اور دوسرے یہ کہ ایسے شعرا کی ادبی خدمت جنھیں دراصل ادب کی خدمت نہیں کرنی چاہئے۔ (شہیب علی حسین)

جواب استفسار

ہماری زبان یکم دسمبر ۱۹۹۷ء میں حضرت ثاقب صدیقی کا استفسار کہ "شود واصفی کی غزل کس وزن پر ہے اور وہ وزن کس بحر کا ہے؟" ایک سوتی بھی مصلحت کی بنا پر ہے۔ ثاقب صاحب کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غزل بحر سے خارج ہے جیسا کہ رتن صاحب نے ظاہر کیا ہے میرے خیال میں ان کا منشا یہ ہے کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے ضرور۔ وہ اس قسم کی چٹکیاں عروض کا فقدان دیکھ کر لیتے ہیں۔ عروض سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ ۸ر جنوری ۹۸ء

کے شمارے میں چار حضرات نے نشور صاحب کی غزل کا وزن "بحر ہزج سالم مقبوض اشتر" تجویز فرمایا ہے اور یہ نہ سوچا کہ کن اشتر حشو میں کس طرح دخیل ہوسکتا ہے۔ زحاف خرم مختص بصدر و ابتدا ہے اور زحاف شتر مرکب ہے خرم اور قبض سے۔

ابوالحسن اخفش بطال نے خرم کو زحافات عامہ میں داخل کیا ہے اور اس کے علاوہ بھی کافی تحریفیں اس نے کی ہیں جنھیں اہل فن قبول نہیں کرتے۔ جن نیم عروضیوں نے اس کی باتیں قبول کیں وہ انھیں مبارک ہم اس کی کوئی اختراع ماننے کے لیے تیار نہیں۔

وزن حقیقی اور غیر حقیقی کا فرق جاننے والے نشور واحدی کی غزل کو بحر ہزج میں ہرگز غوطہ نہیں دے سکتے۔

اگر ہم حضرات ربع کے وزن فاعلن مفاعلن کو بحر رجز (مستفعلن ×۴) سے بذریعہ زحافات رفع و خبن اخذ کرتے ہیں تو قانون عروض ہرگز مانع نہیں کیونکہ یہ دونوں زحاف عام ہیں۔

اور اگر بحر مقتضب (مفعولات مستفعلن ×۲) سے بذریعہ زحافات طے و رفع فاعلات فاعلن بناتے ہیں تو آئین عروض سے بالکل موزوں ہے کیونکہ یہ زحاف بھی عام ہیں۔

بحر رجز اور بحر مقتضب سے بھی وزن غزل دو دو زحافات سے حاصل ہوتا ہے لیکن بحر جدید (فاعلاتن فاعلن ×۲) سے جو وزن فاعلات فاعلن فاعلات فاعلن حاصل ہوتا ہے وہ صرف ایک زحاف "کف" سے ملتا ہے۔ لہذا یہی وزن اصح ہے یعنی نشور صاحب کی غزل بحر جدید مکفوف میں ہے۔ اور کوئی حکم عروض اس کا مخالف نہیں۔

(عظیم صدیقی)

ایک دعوت فکر

مجھ سے مندرجہ ذیل غزل کے متعلق جناب شوکت عظیم صاحب نے سوال کیا کہ یہ غزل غالب کی ہے یا نہیں۔؟ اور یہ غزل الحاقی و انتحال تو نہیں۔؟ میں نے اس کے متعلق کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی اختیار کی لیکن میرے دل و دماغ میں یہ خیال گردش کرتا رہا کہ یہ غزل کس کی ہے؟ اور چند دنوں بعد میں نے اس غزل کے متعلق محققین سے دریافت کیا لیکن صد حیف کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ کچھ لوگوں نے دعوی بھی کیا کہ یہ غزل غالب کی ہے۔؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اس غزل کو غالب سے منسوب کرنے کے لیے ہمارے پاس کیا دلائل ہیں اور یہ غزل اب تک غالب کے دیوان میں کیوں شامل نہیں کی گئی۔؟

میں غالب کے نقاد اور محققین و اہل تحقیق کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ اس غزل کے متعلق جو بھی معلومات ہوں اسے "ہماری زبان" کے ذریعہ ہم سب تک پہنچائیں۔!

غزل:

ہر جستجو عبث ہے جو کہ ہی جستجو نہ ہو　　دل ننگ وحشت ہے جو نہ ہو آرزو نہ ہو

وہ آہ درد ناک کہاں ہے جو لگ جائے برق نگاہ　　ان آنسوؤں پہ خاک کہ جن میں لہو نہ ہو

ممکن نہیں ہے حسن حقیقت کا دیکھنا　　آئینہ مجاز اگر روبرو نہ ہو

ہے کیف بادہ ہیچ ہے رنگ گل فضول　　وہ حسن کیا کہ جس میں حقیقت کی بو نہ ہو

جی بھر کے خوب حسرت و ارمان رو چکا　　اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

غالب نماز عشق کی مقبولیت محال

جب تک کہ اپنے خون جگر سے وضو نہ ہو　　(نثار احمد صدیقی)

(یہ غزل مراسلہ نگار کو کہاں سے ملی ہے اس کا خط میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس غزل کو غالب سے کن لوگوں نے منسوب کیا ہے اس کا بھی کوئی حوالہ نہیں ہے۔ یہ باتیں واضح ہونی چاہییں۔ (ادارہ)

کچھ میرا صفحہ کے بارے میں

"میرا صفحہ" کے اضافے سے ہماری زبان کی افادیت چوگنی ہو گئی ہے اور دلچسپی دو آتشہ ہو گئی ہے۔ صحافت کو سنجیدگی کا رنگ و نور عطا اور شگفتگی و خنکی بخش گیا ہے۔ ایسے میں اس صفحے کا کبھی کبھار بھی گم ہو جانا ذوق سلیم پر گراں گزرنے لگتا ہے۔ بڑا جاذب، بڑا اجاذب، بڑا عالم یہ صفحہ بن چکا ہے۔ "خدارا کسی بھی حال میں صفحہ درخشاں کو غائب از نظر نہ کیجیے۔ اللہ اس کا شانے پر تو رونق افزا رکھے۔" علاج تشنگی داماں کے لیے کوشاں رہیے۔ مگر اس صفحہ کو حیات نو بخشتے رہیے!!

"HONEY MOON" کے متعلق جناب جمیل احمد خاں صاحب کے استفسار پر عرض ہے کہ شوکت تھانوی نے اس کے لیے "وصل" کا استعمال کیا ہے اپنے ناولوں میں ویسے سب سے پہلے مہدی افادی نے اس کے لیے "شب زفاف یا عہد زفاف" کا لفظ دیا تھا!

اس سلسلے میں میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ "ماہ عسل" زیادہ تر بدل معلوم ہوتا ہے ہنی مون کا!! اس میں لفظی حسن بھی ہے اور معنوی حسن بھی۔ ترجمے کا ترجمہ بھی اور معنویت کی معنویت بھی امتزاج آگئی ہے اس طرح ایجاز کا ایجاز بھی اور اعجاز کا اعجاز بھی۔ اپنی اپنی بہار دکھا رہا ہے یہاں!!

"SHOW" شو کیس اردو میں کیا بدل لائیں گے؟ مثلاً "پھول شو" کا کیا ترجمہ کریں گے؟ ارباب زبان سے گزارش ہے کہ اس پر روشنی ڈالیں!!

(عبد الخالق)

انجمن ترقی اردو شاخ اکولہ (مہاراشٹر) کا جلسہ

۱۰ جنوری ۱۹۶۸ء کو عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اکولہ میں انجمن ترقی اردو اکولہ کی جنرل باڈی کا جلسہ چار بجے سہ پہر زیر صدارت خان محمد اصغر حسین ایڈوکیٹ ممبر پارلیمنٹ منعقد ہوا۔ مندرجہ ذیل تجاویز بہ اتفاق آرا پاس ہوئیں۔

تجویز نمبر ۱:۔ چونکہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم بذریعہ علاقائی زبان ہوگی اس لیے یہ جلسہ درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کو مڈل اور ہائی اسکولوں میں انگریزی اور اردو کے علاوہ سہ لسانی فارمولے کے مطابق مراٹھی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلے بھی ضلع پریشدوں کے حکام سے درخواست کی گئی تھی اور انھوں نے اس پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن ابھی تک کئی ہائی اسکول اور مڈل اسکولوں میں مراٹھی کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوا خصوصاً گورنمنٹ ملٹی پرپز ہائی اسکول اکولہ اور گورنمنٹ آئی۔ یو۔ ای۔ ایم اسکول اکولہ میں ہنوز مراٹھی کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ یہ جلسہ ضلع پریشد اکولہ کے حکام سے دوبارہ درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کے لیے کم از کم پانچویں جماعت سے ثانوی اسکولوں میں مراٹھی کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔

تجویز نمبر ۲:۔ گذشتہ سال ناگپور یونی ورسٹی سے احتجاج کرنے پر کالجوں میں اردو کی تعلیم کو جاری رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اندیشہ ہے کہ آئندہ ناگپور یونی ورسٹی کالجوں میں اردو کی تعلیم کو جاری نہ رکھے اس قسم کا اندیشہ پریس میں بھی ظاہر کیا گیا ہے لہذا یہ جلسہ ناگپور یونی ورسٹی کے وائس چانسلر سے درخواست کرتا ہے کہ اردو داں طلبہ کو بی۔ اے اور ایم۔ اے تک اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کی جائے اور آئندہ ایسے حالات نہ پیدا کیے جائیں جن سے گذشتہ سال علاقائی انجمن ترقی اردو ودربھ کو ایجی ٹیشن کرنے پر مجبور کیا۔

بعد ازاں علاقائی انجمن ترقی اردو ودربھ کی ہدایت کے مطابق عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا۔ تمام عہدیدار تحریک و تائید کے بعد بہ اتفاق آرا منتخب ہوئے۔

(۱) صدر:۔ جناب خان محمد اصغر حسین ایڈوکیٹ و ممبر پارلیمنٹ اکولہ

(۲) نائب صدر:۔ جناب قاضی محمد علی صاحب ایڈوکیٹ۔ اکولہ

(۳) " " :۔ جناب رام رنگ صاحب آمر مالک پنجاب کشمیر ہوٹل اکولہ

(۴) سکریٹری:۔ جناب بشیر احمد صاحب شہید ایم۔ اے۔ ہیڈ ماسٹر عثمان آزاد اردو ہائی اسکول اکولہ

(۵) نائب سکریٹری:۔ جناب سید علی محسن شہید پروپرائٹر ناولٹی اسٹورس محمد علی روڈ۔ اکولہ

(۶) نائب سکریٹری:۔ جناب مان خاں صاحب آرزو۔ اکولہ

(۷) خزانچی:۔ جناب خواجہ ابرار محمد صاحب عثمان آزاد اردو ہائی اسکول۔ اکولہ

(۸) رکن مجلس منتظمہ:۔ جناب محمد اسمٰعیل صاحب ہیڈ ماسٹر اکولہ

(۹) " " :۔ جناب محبوب خاں صاحب رونق اکولہ

(۱۰) " " :۔ جناب ڈاکٹر محمد اسحاق صاحب اکولہ

(۱۱) " " :۔ جناب حکیم ڈاکٹر ٹھاکر پرتاپ سنگھ صاحب اکولہ

(۱۲) " " :۔ جناب محمد ابراہیم صاحب بسمل وکیل اکولہ

(۱۳) " " :۔ جناب عبدالرحمٰن صاحب نیاز اکولہ

(۱۴) " " :۔ جناب سید مظفر علی صاحب میونسپل ممبر اکولہ

(۱۵) " " :۔ جناب محسن انصاری صاحب لیکچرر اکولہ

(بشیر احمد شہید سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند شاخ اکولہ)

"نئے نام" کے فنکاروں کے ساتھ ایک شام

موجودہ ادبی میلانات پروفیسر آل احمد سرور کی نظر میں

حیدرآباد ۱۹ جنوری۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لیگ آف ڈیموکریٹک یوتھ اعظم پورہ کے زیر اہتمام "نئے نام" کے فنکاروں کے ساتھ ایک شام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں جدیدیت کا رجحان اس اعتبار سے فال نیک ہے کہ اس نے اردو کے ادیبوں کو اپنی ذات اور اپنے اندر کے آدمی کو ٹٹولنے کا سلیقہ سکھایا۔ اب وہ مانگے تانگے کی عینک سے زندگی کے خد و خال کو دیکھنے کی بجائے اپنی نظر پر بھروسہ کرنے کی صلاحیت حاصل کر رہا ہے۔ ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک جامع اور جکڑا رویہ مناسب نہیں ہوتا۔ پروفیسر سرور نے جدید ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ بندھے ٹکے معیار حسن سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ اس بات کی تلاش کرنی چاہیے کہ شاعر یا ادیب کا معیار حسن کیا ہے؟ پکاسو کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ بدصورتی میں بھی حسن کی تلاش ممکن ہے لیکن اس کے لیے بڑی ہی باریک بیں نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر فنکار قدیم روایات میں عصر حاضر کی وسعتوں کو سمونے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں تو انھیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ نئی روایات اور اقدار وضع کریں۔ کسی بھی نئے تجربے کی حوصلہ شکنی نقادوں کو زیب نہیں دیتی۔

اس ادبی اجتماع کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی۔ "نئے نام" کے فنکاروں میں شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، تاج مہجور، احمد ہمیش، رؤف خلش، حسن فرخ، اکمل حیدرآبادی اور وقار خلیل اس اجتماع میں شریک تھے۔ ابتدا میں یوتھ لیگ کے سکریٹری باسط شریف نے خیر مقدمی تقریر میں "نئے نام" کی اشاعت اور اس کے جموں و کشمیر یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل کیے جانے پر اس میں شامل تمام شاعروں اور اس کتاب کے ترتیب کار شمس الرحمن فاروقی اور حامد حسین حامد کو مبارکباد پیش کی۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے جدید شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جدیدیت کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک مخصوص لب و لہجہ کا نام ہے "نئے نام"

کے شاعروں میں یہی تیکھا لب و لہجہ ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے انھوں نے الفاظ کے صحیح استعمال سے ان کے مطالب و معانی کو وسعت دی ہے۔ سرسری طور سے اس شاعری پر ابہام یا اہمال کا الزام لگا دینا بے معنی بات ہے۔ بعض صاحب نے کہا کہ "نئے نام" کے تمام شاعروں میں صرف ایک شاعر افتخار جالب کی شاعری پر اگر مبہم یا مہمل ہونے کا شبہ ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ اس بات کو کسی حد تک مان لینے کو تیار ہیں۔

محترمہ صفیہ اریب نے اپنے مضمون میں اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ جدیدیت کے حامی اپنی ہی ذات میں کچھ اس طرح کھو گئے ہیں کہ انھیں کوئی چیز ہی نظر نہیں آ رہی ہے۔ یہ رویہ یک طرفہ ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے محض ایک ہی سیاسی نقطہ نظر کی نمائندگی کی تھی اور اس طرح زندگی کے دکھ درد کی بھرپور عکاسی کے لیے ان کے فن میں کوئی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ جدیدیت کا رجحان اسی رویہ کا شدید رد عمل ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے "نئے نام" کے بارے میں کہا کہ ان ناموں میں بعض مشاق شاعروں کے نام بھی شامل ہیں۔ انھوں نے جدیدیت میں کہیں کہیں روایات سے مکمل انحراف کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا۔ انھوں نے "نئے نام" کے شاعروں کو مشورہ دیا کہ وہ تجرباتی دور ہی میں اپنی شہرت و مقبولیت کی جد و جہد سے احتراز کریں۔ اور زمانہ کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ افکار و اذہان کو سمجھ سکے۔

اس ادبی اجتماع کا اختتام ایک محفل نظم گوئی پر ہوا جو سلیمان اریب کی صدارت میں ترتیب دی گئی۔ اس محفل نظم میں "نئے نام" کے موجود شاعروں کے علاوہ سلیمان اریب، حکیم یوسف حسین خاں، مغنی تبسم، انور معظم، غیاث متین، مسعود عابد، برق یوسفی، رحمان جامی، اعلیٰ اصغر، علی الدین نوید اور محترمہ خورشید نذیر نے اپنی نظمیں سنائیں۔

کاشی ودیاپیٹھ وارانسی میں اردو تعلیم کی اجازت

انجمن ترقی اردو بنارس کا ایک وفد بابو کرشن موہن صاحب ایڈوکیٹ، مولوی حبیب اللہ صاحب ایڈوکیٹ، مولوی محمد ادریس صاحب ایڈوکیٹ، بابو شیو ناتھ پرشاد صاحب لکچرار، مولانا احمد مکرم عثمی صاحب، ڈاکٹر رمضان علی صاحب منشی داتا رسول صاحب پر مشتمل بتاریخ ۱۳ جنوری ۱۹۶۸ء عالی جناب بابو راجا رام شاستری صاحب وائس چانسلر کاشی ودیاپیٹھ وارانسی سے ملا اور ان کی خدمت میں ایک یادداشت بغرض اجرائے تعلیم اردو پیش کی۔

صاحب ممدوح نے نہایت خندہ پیشانی و ہمدردی کے ساتھ یادداشت اور وفد کی باتوں کو سنا اور وفد کے خیال و تجویز کو سراہا اور فرمایا کہ اردو پورے ملک کی قومی زبان ہے۔ وائس چانسلر صاحب موصوف نے وفد کو بتایا کہ کاشی ودیاپیٹھ میں فارسی کی تعلیم کی اجازت دی جا چکی ہے اور انھوں نے وفد کو یقین دلایا کہ اردو کی تعلیم کے لیے نوٹس فوراً جاری کر دی جائے گی۔ کہ جو طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں وہ اردو پڑھ سکتے ہیں۔

اراکین وفد نے اس کے لیے جناب وائس چانسلر موصوف کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔

(داتا رسول سکریٹری شعبۂ تعلیم انجمن ترقی اردو بنارس)

انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی میں یوم جمہوریت پر خصوصی شعری نشست

علی گڑھ ۲۶ جنوری۔ سال ہائے ماسبق کی طرح امسال بھی یوم جمہوریت کے موقع پر انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ایک شعری نشست کا انعقاد ہوا جس کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور نے کی۔

یوم جمہوریت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ ہم ہر سال شعر و سخن کی اس خصوصی نشست کے ذریعہ جمہوریت سیکولرازم اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر اپنے ایمان کو تازہ کرتے ہیں اور جمہوری قدروں کے استحکام کے لیے نئے سرے سے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔

اردو کے چوٹی کے شاعر فراق گورکھپوری کو پدم بھوشن کے اعزاز پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سرور صاحب نے فرمایا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حکومت ادیبوں دانشوروں اور فنکاروں کی طرف توجہ دے رہی ہے اور ان کی قدر کرتی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ فراق صاحب کے علاوہ اس سال جن دوسری زبانوں کے فنکاروں اور ادیبوں کو اعزازات ملے ہیں میں ان سب کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اس نشست میں جناب پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی، خواجہ مسعود علی ذوقی، ڈاکٹر خلیق الرحمٰن، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر خلیق احمد صدیقی، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر وارث کرمانی، شہریار، زاہدہ زیدی صاحبہ، ساجدہ زیدی صاحبہ، ڈاکٹر رشید بدر، مس زیتون عمر، ڈاکٹر عشرت حسن، انور بشیر بدر، صبا جائسی، ذکاء الدین شایاں، امیر عارفی، انجم محمود، شمس طہرانی، انور جلال پوری اور باقر زیدی نے اپنا منتخب کلام سنایا۔

انجمن ترقی اردو ہوشیار پور میں بزم مشاعرہ

ہوشیار پور ۱۵ جنوری: انجمن ترقی اردو پنجاب "ہوشیار پور" کے اہتمام سے ایک مشاعرہ جناب ڈی۔ این گپتا صاحب پی۔ سی۔ ایس۔ مجسٹریٹ درجہ اول کے دولت کدہ پر منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض اردو کے نامور شاعر جناب امر چند قیس جالندھری نے ادا کیے۔

مقامی شعرا میں پرنسپل سالک، پروفیسر ہری مہتہ برق، جناب مہر گیر جناب اوناش چندر رشود، جناب محسن کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

شعرا میں ارمان صاحب پٹھان کوٹ سے امید صاحب اور جموں سے سرکشن صاحب نے شرکت کی۔

پنجابی زبان کے مشہور ترقی پسند شاعر جناب جوگندر اور ہندی کے شعرا پروفیسر بھاردواج اور ڈاکٹر رام پرکاش شرد نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

صدر کے کلام کے بعد میزبان نے شعراء اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی کی دو ادبی نشستیں

انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک جلسہ ۳ر دسمبر ۱۹۶۷ء کو آرٹس فیکلٹی جامعہ ملیہ میں شام کو چار بجے منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اس ادبی نشست میں ڈاکٹر اجمل اجملی نے ایک مضمون پڑھا جس کا عنوان تھا "ترقی پسند تحریک کا سماجی اور سیاسی جائزہ"۔ اجملی صاحب نے سید سجاد ظہیر صاحب کی انگریزی عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے اس خیال سے اختلاف ظاہر کیا تھا کہ ادب میں سماجی اور سیاسی پہلو کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔

تاباں صاحب نے سید سجاد ظہیر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈانسر کا پہلا فرض اچھا ڈانسر ہونا ہے۔ بشیر کی بھی یہی حقیقت ہے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے اپنی رائے کی تائید میں پکاسو کی مثال پیش کی اور بتایا کہ بحیثیت ادیب اس کا اولین فرض بحیثیت ادیب ہونا چاہئے۔ اجملی صاحب نے کہا کہ میرا مضمون دراصل ادیب کی سماجی اور سیاسی ذمہ داری پر مبنی ہے۔ جناب صدر نے فرمایا کہ انسان 'کل حقیقت' ہے۔ موضوع اور اسلوب دونوں میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ سماجی، سیاسی پہلو اور فنی احساس کا ساتھ ہونا چاہئے۔ اجملی صاحب نے جن مسائل کا ذکر کیا ہے وہ اس قابل ہیں کہ ہم ان پر غور کریں۔

اس کے بعد ڈاکٹر نامور سنگھ صاحب نے ہندی ادب کے بعض رجحانات پر گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر رام بلاس شرما کے نزدیک ۱۹۳۶ء اور ۱۹۶۶ء کے ادب میں کوئی فرق نہیں ہوا ہے۔ اصلاً ایسا نہیں ہے بلکہ تیس برس بعد ایک طرف ہمارے شعور میں پختگی آئی ہے دوسری طرف حالات کی تبدیلی سے EMPHASIS تبدیل ہوا ہے۔ LIBERALISM آیا ہے۔ ESTABLISHMENT کے حصے بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر نامور سنگھ صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ قدیم ادب کے بارے میں ہمارا رجحان منفی رہا ہے۔ ہم پرم پرا کے پرستار بھی رہے ہیں ہم نے تاریخ کی بہترین چیزوں کو اکٹھا کر کے 'روایت' کا نام دیا۔ رجعت پسندوں کے خلاف نعرہ لگایا اور اسے ترقی پسندی کے نام سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ہمارا ذہنی کارواں دو حصوں سے گزرا ہے پہلے ہم نے پرانے فنکاروں کی تنقیص کی۔ تلسی داس اور کالیداس ہماری نظر میں نہیں جچے۔ دوسرے دور میں انھیں فنکاروں کی دل کھول کر تعریفیں کیں۔ اس روایت پرستی نے احیاء مذہب کی تحریک کو سہارا دیا۔

ڈاکٹر نامور سنگھ صاحب نے نئے شعراء کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے یہاں انسانیت، مذہب اور سائنس کے خلاف لکھنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے۔ ہمارے شاعر پہلے ہندستانی اور پھر انگریزی شکل پسندی کی طرف مائل ہیں جب کہ پاکستانی شعراء آسان زبان اختیار کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نامور سنگھ صاحب نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ دلائی کہ پاکستان میں مقیم ہندوستانی مہاجر شعراء کے کلام میں NOSTALGIA کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔ ہندی ادب میں اس کا غلط طور پر پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ یہ خطرناک رجحان ہے۔

تاباں صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ پاکستانی شعراء جب ہندوستان میں تھے تب بھی اس طرح لکھتے تھے حفیظ کی زبان آسان ہے فیض کی نہیں ہے۔ مسعود الحسن غزالی صاحب نے کہا کہ پاکستانی شعراء کی اکثریت نے آسان زبان اختیار کی ہے اور مجھے اپنی گلی، اپنا شہر وغیرہ میں حسن نظر آتا ہے۔

جناب صدر نے فرمایا کہ پاکستانی شعراء کے اس رجحان یعنی یاد وطن کے عارضہ سے شاعریت کو تقویت ملی ہے اصلاً روایت پسند اور جدید دونوں قسم کے شعراء فرار کی طرف جا رہے ہیں۔

اس بحث کے بعد تاباں صاحب نے اپنی تازہ، دلربا اور جاندار غزل سنائی آخر میں سکریٹری انجمن نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور جناب صدر کی اجازت سے جلسہ ختم ہوا۔

انجمن کی دوسری ادبی نشست ۱۲ر جنوری ۱۹۶۸ء کو ہوئی جس میں مقامی حضرات کے علاوہ ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر فضل الحق، ڈاکٹر شارب ردولوی اور صغیر احمد صوفی نے شرکت کی۔

جلسہ کی صدارت محترمہ صالحہ عابد حسین نے فرمائی۔ انھوں نے اپنی ایک کہانی سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا جس کا عنوان تھا: رویّے، نظریے اور ادب۔

معین الدین صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے دریافت کیا کہ بعض شعراء مثلاً کمار پاشی کا خیال ہے کہ شاعری غیر شعوری عمل ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ لوگ بکھرے ہوئے شعور کا حصہ یعنی ارباب اقتدار کا نظریہ قبول کر لیتے ہیں۔

محترمہ صالحہ عابد حسین نے فرمایا کہ مقالے میں ارباب اقتدار کے نظریے کی وضاحت کرنی چاہئے نیز یہ کہ ذہن انسانی نے کس طرح ارباب اقتدار کے نظریے کو اپنایا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ طبقات کی خدمت کرنے والے نظریے ہیں۔ میرا اصرار اس بات پر ہے کہ جو لوگ نظریے کی نفی کرتے ہیں وہ اصلاً ذرائع ابلاغ کے سہارے ارباب اقتدار کے نظریے کو اپنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد صغیر احمد صوفی صاحب نے اپنی ایک غزل سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ سکریٹری انجمن نے شکریہ ادا کیا اور صدر کی آخری گفتگو کے ساتھ جلسہ ختم ہوا۔

(سکریٹری سیفی پریمی)

مولانا آزاد کالج کلکتہ میں مشاعرہ

علامہ رضا علی وحشت کی یاد میں ہر سال کی طرح اس بار بھی مولانا آزاد کالج کلکتہ کی اردو لٹریری سوسائٹی کی جانب سے ایک شاندار مشاعرہ

منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ اکیس جنوری ۱۹۶۸ء کو منایا گیا۔ اس مشاعرہ میں تقریباً تمام مقامی شعراء موجود تھے۔ شعراء حضرات اور سامعین میں مشاعرہ کی یادگاری کتاب تقسیم کی گئی۔
مشاعرہ کی کامیابی میں پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب، پروفیسر نیاز احمد خاں صاحب، پروفیسر فخرالدین اثر صدیقی، پروفیسر مجیب الرحمٰن عرفی، پروفیسر محمد امین صاحب اور پروفیسر مظہر حسن صاحب کی کوششیں قابل ستائش ہے۔ انچارج مشاعرہ پروفیسر نثار شاہدی صاحب اور پروفیسر ایم۔ اے۔ ہاشمی صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اردو لٹریری سوسائٹی جنرل سکریٹری انیس الرحمٰن صاحب کا مشاعرہ کی کامیابی میں بڑا حصہ ہے۔

(ایم۔ اے نقر کلکتہ)

صدر انجمن ترقی اردو شاخ بہار کی اپیل

پٹنہ۔ غلام سرور صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو نے اپنی انجمن کی تمام شاخوں نیز بہار کے تمام محبانِ اردو کے نام اپنی ایک پرزور اپیل میں کہا ہے کہ نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ جنوری کا مہینہ ہے تعلیمی اداروں کا نیا سیشن اب شروع ہونے والا ہے۔ اسکولوں میں داخلے ہو رہے ہیں۔ اس ملک میں تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے، اردو بچوں کا مستقبل سنوارنے کے نقطۂ نظر سے، لسانی اقلیتی اسکولوں کی بنیاد مستحکم کرنے کے مقصد سے اور ان تمام اسکولوں کو تقویت پہونچانے کی غرض سے جہاں اردو تعلیم کا معقول بندوبست ہے میں بہار بھر میں پھیلی ہوئی اپنی ڈھائی سو مقامی شاخوں سے خاص طور پر اور لاکھوں اردو دوستوں سے عام طور پر یہ درخواست کرتا ہوں کہ پورے مہینے میں بچوں کے اسکولوں سے لے کر ہائر سکنڈری اسکولوں تک اپنے بچوں اور بچیوں کا زیادہ سے زیادہ داخلہ کرائیں اور اس کی مہم چلائیں، چندہ اور پندرہ روزہ منا کر اس مہم کو کامیاب بنائیں۔

کوکن اردو رائٹرز گلڈ کا قیام

مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۶۸ء بروز بدھ کوکن کے چار اردو فنکاروں کے اشتراک سے ایک اشاعتی ادارہ "کوکن اردو رائٹرز گلڈ" کا قیام عمل میں آیا جس کے ڈائریکٹر میں ساحر شیوی، تنویر کار، بدیع الزماں خاور اور یعقوب راہی کے نام شامل ہیں۔ اس گلڈ کے ذریعہ کوکن کے ادیبوں اور شاعروں کی معیاری تصانیف شائع کی جائیں گی۔ اور اردو اور مراٹھی کے ادیبوں کو قریب لانے اور ان کے منتخب ادب کو دونوں زبانوں میں ڈھالنے کی کوشش کرے گا۔
گلڈ کی طرف سے جو پہلی کتاب شائع ہو رہی ہے وہ داؤد غازی مرحوم کا مجموعۂ کلام "وقت کی صدیاں" ہے۔ (سکریٹری یعقوب راہی)

کملا راجہ گرلز کالج گوالیار میں مشاعرہ

انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کی قیادت میں گوالیار کے عوام گذشتہ کئی سال سے یہاں کے کملا راجہ گرلز کالج (اور ایم۔ ایل۔ بی آرٹس اینڈ کامرس) کالج میں شعبۂ اردو کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے جس کے نتیجے میں سال گذشتہ کملا راجہ گرلز کالج میں اردو لکچرار کی حیثیت سے مسٹر پروین حق کا تقرر عمل میں آیا۔
۱۵ر جنوری کو شعبۂ اردو کی جانب سے اس کالج میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں کئی بیرونی شعراء نے شرکت فرمائی اور اپنے پرلطف اور دلچسپ کلام سے جملہ طالبات اور اساتذۂ کالج کو مسرور و محظوظ فرمایا۔ جن شعراء نے اس مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔
جناب بجلی بلرام پوری، جناب شیر جھانوی، جناب وقار صدیقی، جناب ماہر الحمیدی، جناب دل لکھنوی، جناب مظفر رزمی، جناب ضیا انجم، جناب آفتاب لکھنوی، جناب طالب رام پوری۔ اس کے علاوہ سیدہ صاحبہ (بمبئی) اور رشیدہ بانو صاحبہ (دہلی) سے تشریف لائی تھیں۔
اس مشاعرہ کی صدارت کے فرائض جناب پریم چند کشیپ سوز سابق ایم۔ ایل۔ اے نے ادا کیے اور تعارف شعراء جناب بجلی صاحب نے فرمایا۔ یہ دلچسپ محفل مشاعرہ گیارہ بجے دن سے ڈھائی بجے تک رہی۔ اختتام محفل پر مسز پروین حق لیکچرار اردو نے جملہ شرکاء سامعین اور شعراء حضرات کا شکریہ ان کی ادب نوازی اور زحمت فرمائی کر کے ادا کیا۔

(پروین صدیقی کملا راجہ گرلز کالج گوالیار)

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کا جلسہ

شعبۂ اردو کے زیر اہتمام ایک جلسہ ۲۲ر جنوری ۱۹۶۸ء کو یونیورسٹی بلڈنگ کے کمرہ نمبر ۳۰ میں منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض جناب شمیم احمد خاں غوری استاذ دہلی یونیورسٹی شعبۂ ہذا نے ادا کیے۔ جلسے میں اردو مخطوطات شناسی کے طالب علم امیر اللہ صاحب شاہین نے پرتھوی راج راسا کی تاریخی حیثیت پر ایک مقالہ پڑھا۔
امیر اللہ صاحب شاہین نے اپنے مقالہ میں چند بردائی کی شخصیت کے بارے میں مورخین اور محققین کے مختلف شکوک و شبہات کا جائزہ لیا اس کے بعد صاحب مقالہ نے پرتھوی راج راسا کے مختلف مخطوطات کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ بعض مخطوطے ضخیم ہیں بعض بہت مختصر اور بعض درمیانی ضخامت کے ہیں ایسی صورت میں یہ طے کرنا بہت دشوار ہے کہ اصل مخطوطہ کون سا ہے اور جعلی اور الحاقی حصے کون سے ہیں البتہ مختلف نسخے، مقامات اور الفاظ اور تاریخی شواہد کی مدد سے صاحب مقالہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ شکل میں پائی جانے والی پرتھوی راج راسا مستند نہیں ہو سکتی اس کے علاوہ راسا کے بیانات کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لینے کے بعد مقالہ نگار نے واضح کیا کہ راسا کے بیانات کو تاریخی واقعات کے اعتبار سے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔
جلسہ کے آخر میں ابو الحسنات قیامی محمد خاں، ڈاکٹر عبد الحق، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے بحث میں حصہ لیا۔

(قاضی سید ظہیر الحسن سکریٹری شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی)

لسانی اقلیتوں سے متعلق مدھیہ پردیش گورنمنٹ ٹیچرس

ایسوسی ایشن گوالیار کی تجاویز

حال ہی میں مدھیہ پردیش سرکار نے ضابطۂ تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل کی ہے جس کے صدر جناب چندر پرتاپ تواری ایم۔ ایل۔ اے ہیں۔ اس کمیٹی نے مدھیہ پردیش کے تمام اہم مقامات مثلاً اندور، بھوپال، اوجین، رائے پور، جبلپور اور گوالیار کا دورہ کیا اور ٹیچرس، ماہرین تعلیم، اساتذہ کی انجمنوں کے عہدہ داروں اور ممبروں سے تعلیمی مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا۔ جب یہ کمیٹی گوالیار پہونچی تو ۱۱ جنوری کو مدھیہ پردیش گورنمنٹ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا ایک وفد ایسوسی ایشن کے صدر جناب نول شرما کی قیادت میں ملا اور ایک میمورنڈم پیش کیا۔ وفد کے دیگر ممبران کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب ریاض محمد صدیقی، جناب گھنشیام کشیپ اور جناب نیاز ٹیچر۔ میمورنڈم میں لسانی اقلیتوں سے متعلق مندرجہ ذیل اہم تجاویز پیش کی گئیں۔

(۱) پرائمری اور مڈل درجات کا ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو، چھٹی جماعت سے رائج بھاشا ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے۔

(۲) جن محلوں اور بستیوں میں لسانی اقلیت کی قابل لحاظ تعداد رہتی ہو وہاں اس زبان کا ایک پرائمری اسکول لازمی طور پر کھولا جائے، چاہے ابتدا میں بچوں کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ باقی بستیوں کے اسکولوں میں کسی ایک اقلیتی زبان کے کم سے کم پانچ طلبہ ہونے پر علیحدہ سے اس زبان کے ٹیچر کا انتظام کیا جائے۔

(۳) ہائر سکنڈری اسکولوں میں جہاں اردو، مراٹھی اور سندھی وغیرہ زبانیں پڑھائی جاتی ہیں، ایسے اسکولوں میں ان زبانوں کے لیکچرار کی پوسٹ قائم کی جائیں۔ اب تک مدھیہ پردیش کے ہائر سکنڈری اسکولوں میں ہندی اور انگریزی کے لیکچرار ہوتے ہیں باقی زبانوں کے لیکچرار کا تقرر نہیں کیا جاتا۔ (نامہ نگار)

اردو شاعری میں تاج محل کی رسم اجراء

اردو پبلیکیشنز دہلی کی پہلی کتاب "اردو شاعری میں تاج محل" کی رسم اجرا کا جلسہ جناب گوپی ناتھ امن کی صدارت میں ۲۰ جنوری کو ساڑھے پانچ بجے شام ہوبی لاج میں ہوا۔ صاحب صدر اور ارکان اردو پبلیکیشنز کے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، پروفیسر جاوید وششٹ صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر یونس جعفری شعبہ فارسی جامعہ کے پی شرما شعبہ پولیٹیکل سائنس، عبد اللطیف اعظمی صدر شعبہ تاریخ دہلی کالج، کنور ناتھ ایڈیٹر ادب، ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، وغیرہ حضرات شامل تھے۔ (ظفر ادیب)

صفحہ ۵ سے آگے

جنوری ۱۹۰۲ء میں سے بارہ سال گیارہ ماہ منہا کرنے کے بعد فروری ۱۸۸۹ء آتا ہے۔ اس طرح فروری ۱۸۸۹ء قاضی صاحب کی پیدائش کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرے بیانات کے مقابلے میں اس بیان اور ذریعہ پر نسبتاً زیادہ اعتماد اور بھروسہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ زمانہ قاضی صاحب کی حقیقی بہن اور ان کی موجودہ بیگم کے بیان سے دوسرے بیانات کے مقابلے میں بہت زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا قاضی صاحب کی ہمشیرہ اور ان کی بیگم کا بیان یہ ہے کہ انتقال کے وقت قاضی صاحب کی عمر چھیاسٹھ سال تھی اس عمر کے حساب سے قاضی صاحب کا زمانہ پیدائش ۱۸۹۰ء کے ابتدائی ایام یا پھر ۱۸۸۹ء کا آخری زمانہ رہا ہوگا۔ اور قاضی صاحب کے مڈل اسکول سارٹیفکٹ میں لکھی ہوئی عمر کے حساب سے ان کا زمانہ پیدائش فروری ۱۸۸۹ء نکلتا ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس فرق کو نظر میں رکھتے ہوئے ان دونوں زمانوں میں سے کس زمانے کو ترجیح اور اولیت دیں۔

تو عقل سلیم کا تقاضہ تو یہی ہے کہ ۶۶ کے زبانی بیان کے مقابلہ میں احتیاط کے طور پر ۱۹۰۲ء کے اس تحریری حوالے کو اولیت اور ترجیح دی جائے۔ اور مڈل اسکول سارٹیفکٹ پر تحریر شدہ عمر کے حساب سے نکالے ہوئے زمانہ پیدائش یعنی فروری ۱۸۸۹ء کو ہی قاضی عبد الغفار کا زمانہ پیدائش سمجھا جائے لیکن میرے خیال میں حرف آخر اسے بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ اسکول میں عمر درج کرانے کے متعلق مختلف رجحان رہے ہیں۔ کبھی بڑھا کر لکھائی جاتی رہی ہے اور کبھی گھٹا کر۔ پہلی صورت جب ہوتی ہے جب کہ بچہ بہت کم عمری میں ہو اور ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھنے کی مقررہ عمر سے زیادہ فاصلہ ہو جانے کا ڈر ہو۔ آخری صورت یعنی گھٹا کر عمر لکھانے والی صورت تب پیدا ہوتی ہے جب کہ بچے کی عمر کافی ہو اور تعلیمی منازل وہ سستی سے طے کرنے کا عادی ہو۔ اس طرح تعلیم سے فارغ ہونے تک سرکاری نوکری سے محروم ہونے کا خوف رہتا ہے۔ اس صورت حال میں سرپرست یا خود طالب علم اپنی عمر کم لکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں کونسی صورت رہی ہوگی یا ان دونوں صورتوں میں سے ایک بھی نہ ہو بلکہ صحیح عمر ہی درج کرائی گئی ہو۔

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر نصیر الدین خیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا